نجیبہ عارف *

فکشن کی سیاسی و سماجی جہات کا مطالعہ

معاصر عہد کو بجا طور پر فکشن کا عہد کہا جا سکتا ہے اور فکشن کی اس مقبولیت کے سبب اس کے مطالعات بھی عملی و ادبی سرگرمیوں کا غالب جز بن گئے ہیں۔ خاص طور پر جامعات میں تحقیقی مقالات لکھنے کے لیے طلبہ کی اکثریت فکشن کو اپنا موضوع بنانے کی خواہش مند نظر آتی ہے۔ بعض جامعات نے تو فکشن کے مطالعے کو اپنی تخصیص بنا لیا ہے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ جب خود استاد بنتے ہیں تو مزید ایسے طلبہ تیار کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں جو فکشن ہی کو اپنی ترجیح اول سمجھتے ہیں۔

اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ شاعری کی مقبولیت میں عالمی سطح پر تدریجی کمی واقع ہوئی ہے۔ امریکا میں تو اس موضوع پر باقاعدہ تحقیق ہو رہی ہے کہ امریکا میں شاعری اور شاعر کیوں ایک ضمنی ثقافت (sub-culture) میں ڈھل گئے ہیں؟ یعنی یہ کہ شاعری کا حلقۂ اثر شاعروں تک ہی محدود کیوں ہو گیا ہے اور معاشرے کی اکثریت شعر کی اہمیت سے غافل یا بے نیاز کیوں ہوگئی ہے؟[1]

تاہم پاکستانی معاشرے، خصوصاً نوجوان نسل کے شاعری کی نسبت فکشن کو ترجیح دینے کی وجوہات قدرے مختلف ہیں۔ اس کی ایک سیدھی سادی اور سامنے کی وجہ تو یہ ہے کہ ہر زبان کی طرح

اردو نے بھی اپنے ارتقا کے سفر کا آغاز شاعری سے کیا اور نثر میں بھرپور، مؤثر اور خیال انگیز ابلاغ کی نوبت ذرا بعد میں آئی۔ اردو شاعری کی تاریخ تو کم از کم چار سو سال پرانی ہے لیکن اردو فکشن ابھی کل کی یعنی بیسویں صدی کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے اس میں نئے امکانات کا وافر ذخیرہ موجود تھا اور اس نے نئی نسل کو جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شعر کی نسبت نثر زیادہ واضح، دوٹوک اور ابہام سے پاک ہوتی ہے اور اس دقتِ نظری اور دماغ سوزی کی متقاضی نہیں ہوتی جیسی کسی اچھے، پہلو دار شعر کے لیے درکار ہوتی ہے۔ جدید عہد میں ذہنی ورزش کو ذہنی عیاشی کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے اور ترجیحاً ایسے ادب پاروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اپنے مفاہیم تک بہ آسانی رسائی دیتے ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ نثر کو مخصوص مقاصد اور نتائج کے حصول کے لیے استعمال کرنا آسان تر ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ اہم اور نتیجہ خیز ہیں لیکن ان تمام اسباب سے زیادہ جس پہلو نے شعر کی نسبت فکشن کو عہد حاضر کی مقبول ترین صنف بنا دیا ہے، اس کا ذکر کرنا بحیثیت استاد میرے لیے خاصی شرمندگی کا باعث ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعری انسانی ذہن کا ایسا برتر وظیفہ ہے جس کے ادراک اور تحسین دونوں کے لیے نہ صرف ذہنی و ذوقی بلندی درکار ہے بلکہ زبان کی نزاکت و لطافت سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ شعر کو سمجھنے اور اس سے لطف اٹھانے کے لیے زبان کے قواعدی ڈھانچے کی جکڑ بندی سے نکلنا پڑتا ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس قواعدی ڈھانچے سے گہری واقفیت ہو۔ بدقسمتی سے گذشتہ ربع صدی کے دوران پاکستان میں اُردو زبان کی تدریس کا عمل انتہائی منتشر اور بے ربط رہا ہے۔ پرانے روایتی تدریسی طریقوں کو ترک کر دیا گیا لیکن جدید لسانی اصولوں کو بہتر طور پر اپنایا نہ جا سکا۔ نتیجہ یہ رہا کہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم سے ہم کنار ہوئے اور قوم بیٹھے بٹھائے بے زبان ہوگئی۔ ایسے میں شاعری کا چراغ جلنا مشکل تھا۔ اس لیے بس وہی شاعری قبولِ عام حاصل کر پائی جو ''مقبول شاعری'' کے زمرے میں آتی ہے۔ سنجیدہ شاعری صرف شعرا کے درمیان گردش کرتی ہے یا پھر نقاد کسی خاص محرک کے تحت اسے پرکھتا اور اس پر کوئی حکم لگاتا ہے۔ ادبی ذوق رکھنے والے زیادہ تر قارئین، خصوصاً وہ نسل جو گذشتہ پندرہ بیس برس کے دوران تعلیمی زندگی سے نکل کر عملی زندگی میں آئی

ہے، اپنے ذوق کی تسکین کے لیے فکشن کی طرف راغب ہے۔ یہ بات بطور شکایت نہیں بلکہ طویل تدریسی تجربے کی روشنی میں بطورِ امرِ واقعہ بیان کی گئی ہے۔

پاکستان میں گذشتہ دس برس کے دوران اردو تنقید کی سب سے زیادہ کتابیں فکشن کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔[۲] ان میں سے محض چند ایک کتابیں ایسی ہیں جو فکشن کے نظری مباحث پر مشتمل ہیں۔[۳] زیادہ تر کتابیں عملی تنقید سے متعلق ہیں اور مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے اردو فکشن کے مطالعات پیش کرتی ہیں۔ عملی تنقید کی یہ کتابیں جب فکشن کو زیرِ بحث لاتی ہیں تو عام طور پر اس کے موضوع تک ہی محدود رہتی ہیں۔ نظری مباحث میں فکشن کے جو اجزا اور عوامل گنوائے جاتے ہیں، عملی تنقید کے دوران شاذ ہی ان میں سے کوئی زیرِ بحث آتا ہے۔ نقاد، بالخصوص سندی مقالے لکھنے والے محقق جب فکشن کا مطالعہ کرتے ہیں تو کہانی اور موضوع ہی کو توجہ کا مرکز بنائے رکھتے ہیں۔ عام طور پر کسی خاص نقطۂ نظر کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور پھر اس نقطۂ نظر کی چمٹی پکڑ کر فکشن سے اس کی مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جاتی ہیں۔ یا پھر بغیر کسی نقطۂ نظر کے موضوعات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ بطور ممتحن مجھے ایسے کئی تحقیقی مقالے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جن میں فکشن کے مطالعے کو محض اس کے موضوع تک محدود کر دیا گیا ہے۔

یہ موضوعات زیادہ تر دو قسم کے ہوتے ہیں، معاشرتی یا سیاسی۔ یعنی کسی خاص معاشرتی مسئلے، مثلاً طبقاتی تفریق، معاشی ناہمواری، جاگیر دارانہ نظام، مذہبی انتہاپسندی، ضعیف الاعتقادی، عورت کا استحصال وغیرہ کا تعین کرنے کے بعد مختلف فکشن نگاروں یا کسی ایک عہد کے فکشن میں ان کے اظہار کی صورتیں تلاش کی جاتی ہیں یا پھر کسی خاص سیاسی مکتبِ فکر کے تحت فکشن نگاروں کے سیاسی نظریات یا جھکاؤ کے ثبوت ڈھونڈے جاتے ہیں۔

ان موضوعات میں نوجوان محققین کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیشِ نظر یہاں اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی کہ فکشن میں سیاسی و سماجی جہات اور معاملات کا اظہار کیسے ہوتا ہے؟ کیا یہ اظہار اتنا سادہ اور یک رخا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا فکشن کی فنی باریکیوں، تکنیک کے تنوع اور فکشن نگار کی مہارت کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے یا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی

اس مقالے میں، یہ دیکھنے کے بجائے کہ اردو فکشن میں سیاسی و سماجی تغیرات کا اظہار کہاں کہاں ہوا ہے، کون کون سے واقعات ایسے ہیں جو فکشن میں اظہار پذیر ہوئے ہیں اور کن کن فکشن نگاروں نے سیاسی و سماجی معاملات سے اپنی دلچسپی اور دوسرے لفظوں میں عصری شعور کا اظہار کیا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فکشن میں سیاسی و سماجی تغیرات کس طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ فکشن اور سیاسی و معاشرتی واقعات کا آپس میں کیا تعلق ہے اور اس تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

اس حقیقت سے سب بخوبی واقف ہیں کہ سیاسی و سماجی واقعات معروضی حقائق ہیں۔ یہ وہ ٹھوس حقیقتیں ہیں جن کا تجربہ ہم اپنے مادی حواس کی مدد سے کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش میں حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں، نظریات اور ترجیحات بدلتی ہیں، پہلی پالیسیاں اور منصوبے رد ہوتے ہیں، نئے بنتے ہیں، ان کے اثرات افراد کی زندگیوں پر براہ راست پڑتے ہیں، چیزیں مہنگی ہوتی ہیں، احتجاج ہوتے ہیں، نظریات کو عمل میں ڈھالنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ ان کوششوں میں کبھی ناکامی ہوتی ہے، کبھی کامیابی۔ مگر یہ سب باتیں ٹھوس تجربات کی طرح محسوس کی جا سکتی ہیں۔ انھیں ثابت کیا جا سکتا، انھیں دیکھا اور دکھایا جا سکتا ہے، پرکھا جا سکتا ہے، ان کے اسباب کا تعین کیا جا سکتا ہے، ان کے اثرات و نتائج کو پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سانحے ہیں جن میں سے بیشتر کے ہم یا تماشائی ہوتے ہیں یا ان کا محلِ وقوع۔ یہ ہم پر خارج سے وارد ہوتے ہیں اور ہم انھیں اپنے باہر دیکھتے اور پاتے ہیں۔

اس کے برعکس فکشن داخل کی واردات ہے۔ یہ ایسے بیانیے کا نام ہے جو حقیقت سے ذرا اوپر اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کی تصویر ہوتے ہوئے بھی پوری طرح حقیقت نہیں ہوتا۔ فکشن حقیقت میں خیال کی آمیزش سے جنم لیتا ہے۔ یہ حقیقت کو نہیں دکھاتا بلکہ حقیقت کو دیکھنے کے ایک زاویے کو دکھاتا ہے۔ ایک نقطۂ نگاہ، ایک آنکھ کی پتلی بھر منظر، ایک شعاعِ نظر۔ فکشن اگر محض حقیقت کی تصویر ہو تو اسے فکشن نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ صحافیانہ رپورٹ ہو سکتی ہے، ادب نہیں۔ جو چیز کسی بیانیے کو ادب کے درجے میں داخل کرتی ہے وہ اس ایک نظر کا زاویہ ہے جو کسی منظر کو شوخ اور کسی کو ہلکا کر کے دکھاتا اور یوں اپنے حسبِ منشا تاثر پیدا کرتا ہے۔

ہمارا یعنی قاری کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم فکشن کو اس طرح ڈوب کر پڑھتے ہیں کہ یہ بھول ہی

جاتے ہیں کہ فکشن کا خدا ہمارے خدا سے بہت مختلف ہے۔ فکشن کے کردار ہمارے خدا نے نہیں، فکشن کے خدا یعنی مصنف نے ڈھالے ہیں۔ وہ جب دنیا میں آتے ہیں تو اتنے معصوم اور بھولے بھالے نہیں ہوتے جتنے ہم دنیا میں آتے ہوئے تھے۔ نہ وہ اتنے غیر جانبدار اور بے لاگ ہوتے ہیں کہ ان کی کہی ہوئی ہر بات پر ایمان لایا جائے۔ یہ کردار ایک خاص مقصد کے تحت تراشے جاتے ہیں اور ان کی اصلیت یہ ہے کہ کسی ملک کی خفیہ ایجنسی کے کارندوں کی طرح منشائے مصنف کے غلام ہوتے ہیں۔ ان کی ہر چال، کتنی ہی بے ساختہ کیوں نہ لگے، سوچی سمجھی اور پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔ وہ فطری انداز میں حرکت نہیں کرتے بلکہ اس طرح حرکت کرتے ہیں، جس طرح انھیں تخلیق کرنے والا طے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ کردار ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ان کی غیر متوقع حرکات ایسا امکان تھیں جو ہمارے ذہن کی رسائی سے باہر تھا اور ہم افسانہ نگار کی ایک نئے امکان کو تلاش کر لانے والی جرأت اور دقتِ نظر سے مرعوب و متاثر ہوجاتے ہیں۔

کرداروں کی طرح فکشن کا بیانیہ بھی، خواہ وہ کسی خارجی اور معروضی حقیقت کا چربہ ہی کیوں نہ ہو، اپنی فطری چال نہیں چلتا، بلکہ مصنف کی فکری جہات کے دائرے میں گھومتا ہے۔ اس بیانیے کی نوعیت ایک ایسے پالتو جانور کی سی ہے جو کتنا ہی آزاد کیوں نہ نظر آئے، اس کے گلے میں پڑی زنجیر کا دوسرا سرا اس کے مالک، یعنی خالق کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ یہ بیانیہ ایک خاص ذہن میں جنم لیتا ہے اور اس ذہن کے فکری و نظری امکانات کی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات بیانیہ خود مصنف کے ہاتھ سے بھی نکل جاتا ہے اور ایک آزاد اور خود مختار حیثیت حاصل کر لیتا ہے لیکن یہ سمجھنا کہ اس صورت میں وہ مصنف کے کل امکانات کی حد سے بھی باہر نکل سکتا ہے، محلِ نظر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ مصنف کے حیطۂ شعور سے باہر نکل کر اس کے تحت الشعور یا لاشعور کے منطقوں میں داخل ہو جاتا ہے اور مصنف یہ محسوس کرتا ہے کہ بیانیہ اس کے اختیاری راستے سے منحرف ہو کر اپنی مرضی کے کسی راستے پر چل نکلا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ کسی ادبی متن کا بیانیہ کلی طور پر خود مختار ہو جائے اور مصنف کی منشا سے بالکل مختلف یا متضاد صورت اختیار کر لے۔

گویا فکشن دھند میں ڈوبے ہوئے شہر کا منظر ہے۔ جس طرح دھند کی ایک تہہ شہر کے اندر

ہوتے ہوئے بھی شہر سے ذرا اوپر اٹھی ہوئی ہوتی ہے، اسی طرح فکشن میں پیش کردہ حقیقت، اصل حقیقت سے کتنی ہی مشابہ کیوں نہ ہو، اس سے ذرا کم یا ذرا زیادہ ہوتی ہے۔فکشن کا یہ کم و بیش ہی اس کی جان اور اس کے ہونے کا جواز ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دیگر تمام فن پاروں کی طرح فکشن بھی، جب ایک بار وجود میں آجاتا ہے تو اس کے بعد بھی کسی ٹھوس حقیقت کا مترادف نہیں بنتا بلکہ قاری کے تخیل، اس کے فہم کی سطح اور رُخ، اس کے مطمحِ نظر کا محتاج رہتا ہے۔ یہ ہر ذہن پر مختلف مقدار میں نزول کرتا ہے۔فکشن کے مفاہیم، یا اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے تمام تر امکانات دراصل اس ذہن کے امکانات تک محدود رہتے ہیں جو فکشن کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس ذہن کی مخصوص ساخت، اس کی ترجیحات، اس کا شعوری رُخ، اس کی لاشعوری کیفیت اور اس کی نظریاتی سمت اس کے فہم متن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس سے اخذِ معانی کے عمل کو ایک مخصوص زاویہ عطا کرتے ہیں۔ یوں فکشن کے مفاہیم کی تشکیل ایک عملِ جاری کی صورت نظر آتی ہے۔ یہ معانی وقت، حالات اور انفرادی فکر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہم بجاطور پر کہہ سکتے ہیں کہ فکشن کے معانی متعین یا طے شدہ نہیں ہوتے بلکہ سیال اور لحہ بہ لحہ کروٹیں بدلتے موّاج سمندر کی مثال ہوتے ہیں، جو کبھی نیلا تو کبھی سبز نظر آتا ہے۔منٹو کے افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ہی کی مثال لے لیجیے؛ وارث علوی نے اس افسانے کے متن کی جو تعبیر کی ہے وہ فتح محمد ملک کی تعبیر سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔اس افسانے کی تعبیر و تفہیم کے مختلف زاویوں پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ تشکیلِ معانی ایک مسلسل عمل ہے۔[۴]

اس لیے ہمیں فکشن کی مدد سے سیاسی تغیرات یا کسی بھی اور حقیقت، تاریخ اور سماج کے کسی بھی پہلو کا کھوج لگاتے ہوئے فکشن کی ماہیت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب ہم فکشن کی سیاسی و سماجی جہات کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد سیاسی و سماجی معروض کی فقط وہ جہات ہیں جنھیں مصنف نے قابل توجہ سمجھا ہے اور انھیں بھی مصنف کے تارِنظر سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔صرف مصنف ہی نہیں، قاری یا نقاد کا فہم متن، نظریہ اور متن کو اپنی مرضی کے معانی عطا کرنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش بھی فکشن کا جز بن جاتی ہے۔ یوں ہم فکشن میں سیاسی و سماجی حقائق کے صرف

بنیاد جلد

محدود، مخصوص اور رنگ آلود مناظر ہی دیکھ پاتے ہیں۔

دوسری طرف یہ حقیقت بھی دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے کہ یہ رنگین شیشوں سے دکھائی دینے والے مناظر بھی بعض اوقات تاریخ کے مسخ شدہ آئینوں سے زیادہ واضح اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ تاریخ، اگر وہ مکمل طور پر غیر جانب دار ہو اور آزادانہ لکھی جائے ؛ جو حقیقی زندگی میں ایسا سہل الحصول مقصد نہیں، تب بھی کسی عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات کا صرف خارجی منظر نامہ پیش کرتی ہے جسے موضوع مطالعہ کے طور پر سمجھا اور پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ نویس کسی سیاسی و سماجی عمل کا محض ناظر یا تجزیہ کار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس فکشن تاریخی معاملات کو ان کرداروں کے حوالے سے پیش کرتا ہے جو ان سیاسی و معاشرتی حالات سے خود گذرتے ہیں اور انھیں جی کر ان کے زشت و خوب اور سرد و گرم سے آشنا ہوتے ہیں۔ تاریخ نویس مکانی اور زمانی فاصلے سے جن احوال کو پرکھتا ہے، فکشن کے کردار انھیں بیت کر دکھاتے ہیں۔ وہ آگ پر محض ہاتھ نہیں تاپتے، خود آگ سے گذرتے ہیں اور یوں ان جیتے جاگتے انسانوں کے نمائندہ بن جاتے ہیں جو مخصوص سیاسی و سماجی حالات کا تجربہ کرتے یا ان سے متاثر ہوتے ہیں۔

فکشن اسی صورت میں اپنی سیاسی و سماجی معنویت کی انتہا کو پہنچتا ہے۔

لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بجا ہوگا کہ فکشن واقعی کسی عہد یا معاشرے کی سیاسی و سماجی جہات کا احاطہ کرتا ہے لیکن ان جہات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں فکشن کی نوعیت کو ضرور زیرِ غور رکھنا چاہیے۔ فکشن حقیقت کا اشاریہ ضرور ہوسکتا ہے لیکن اسے ہو بہو حقیقت کا ترجمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ فکشن بہرحال متخیلہ کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے اس لیے کسی بھی عہد یا واقعے کے منتخب حصوں کو روشن کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں کئی ایسی جہات پوشیدہ رہ جاتی ہیں جو شاید پوری حقیقت تک پہنچنے کے لیے اتنی ہی اہم اور ضروری ہوں۔ کسی عہد کی تمام تر سیاسی و سماجی جہات کو یا کسی ایک منتخب واقعے کے تمام پہلوؤں کو محض کسی ایک فکشنی بیانیے کی روشنی میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات فکشن نگار کسی امر کو طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے اور یوں واقعات کی خلافِ حقیقت تصویر سامنے آتی ہے۔ کبھی تضاد کے ذریعے کسی واقعے کو اجاگر کرنے کے لیے کسی دوسری حقیقت کو اصل سے

زیادہ ابھارا یا ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کسی خاص نقطۂ نظر کی ترویج کے لیے ایسے فرضی واقعات گھڑے جا سکتے ہیں جو ممکنہ طور پر کسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوں۔ کبھی اسلوب کی مدد سے مبالغہ آرائی کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح پڑھنے والا بھی اپنے ذہنی تحفظات یا ترجیحات کے تحت فکشنی واقعات کو اپنی مرضی کا رنگ دے سکتا ہے، انھیں کسی ایک ممکنہ جہت تک محدود کر سکتا ہے یا غیر ضروری توسیع دے کر ان کے معانی کے آفاق کی توسیع کر سکتا ہے، ان کی ایسی توجیہ کر سکتا ہے جو فکشن نگار کے لیے بھی ایک نئی دریافت ہو۔

ادبی تنقید کے وظائف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ زیرِ غور ادب پارے میں معنی کی ایسی تہیں اور سطحیں دریافت کرے جو اس کے معانی کے پھیلاؤ پر منتج ہوں۔ ادب کے مطالعے کے لیے تو یہ تمام سرگرمیاں نہ صرف جائز اور روا ہیں بلکہ اہم سمجھی جاتی ہیں لیکن ان کی بنیاد پر سیاسی و سماجی تاریخ کا تعین کرنا ایک نازک ذمہ داری ہے۔ فکشن کی سیاسی و سماجی جہات مطالعہ کرتے ہوئے ان تمام امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے اور اگر فکشن کی بنیاد پر کسی معاشرے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو حقیقت اور حقیقت کے بیان کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا ازحد ضروری ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* صدر شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ ڈانا گیوا (Dana Gioia) ایک امریکی شاعر اور ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون، بعنوان ''Can Poetry Matter'' میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ امریکا میں شاعر اور شاعری کس طرح اور کیوں معاشرے کے مرکزی دھارے سے ہٹ کر ایک محدود حلقے میں سمٹ گئے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے شاعروں کو جامعات اور دیگر تدریسی اداروں میں ملنے والی نوکریوں اور ان کے اثرات، نیز اکیڈیمک تنقید کی نظریہ سازی اور اس کے ردعمل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کے مکمل متن کے لیے دیکھیے:

http://www.theatlantic.com/past/docs/unbound/poetry/gioia/gioia.htm (مؤرخہ ۳ فروری، ۲۰۱۷ء)۔

۲۔ ان میں سے چند تازہ کتابیں یہ ہیں:

محمد حمید شاہد، اردو فکشن: نئے مباحث (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء)۔

طاہر طیب، لاہور میں اردو افسانے کی روایت (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء)۔

یاسمین حمید، نیا اردو افسانہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)۔
روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)۔
عصمت جمیل، نسائی شعور کی تاریخ: اردو افسانہ اور عورت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)۔

۳۔ مثال کے طور پر دیکھیے:
نسیم عباس احمر، اردو افسانے کے نظری مباحث (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء)۔
سلیم آغا قزلباش، جدیداردو افسانے کے رجحانات (کراچی: انجمن اردو پاکستان، ۲۰۱۶ء (۲۰۰۲ء)۔
اعجاز راہی، اردو افسانے میں علامت نگاری (راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)۔
فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء)۔

۴۔ مفصل مباحث کے لیے دیکھیے:
فتح محمد ملک، سعادت حسن منٹو، ایک نئی تعبیر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۷۵–۸۷۔

مآخذ

احمر، نسیم عباس۔ اردو افسانے کے نظری مباحث۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء۔
اسلم، فوزیہ۔ اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء۔
الماس، روبینہ۔ اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔
جمیل، عصمت۔ نسائی شعور کی تاریخ: اردو افسانہ اور عورت۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔
حمید، یاسمین۔ نیا اردو افسانہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔
راہی، اعجاز۔ اردو افسانے میں علامت نگاری۔ راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔
شاہد، محمد حمید۔ اردو فکشن: نئے مباحث۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء۔
طیب، طاہر۔ لاہور میں اردو افسانے کی روایت۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء۔
قزلباش، سلیم آغا۔ جدیداردو افسانے کے رجحانات۔ کراچی: انجمن اردو پاکستان، ۲۰۱۶ء (۲۰۰۲ء)۔
ملک، فتح محمد۔ سعادت حسن منٹو، ایک نئی تعبیر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

برقی مآخذ

http://www.theatlantic.com/past/docs/unbound/poetry/gioia/gioia.htm (مؤرخہ ۳ فروری، ۲۰۱۷ء)۔